کیا اسلام کی ایک نئی تعبیر ممکن ہے؟

(تحریر: راشد شاز)

عرصہ ہوا مسلمان عہدِ مابعد (post-era) کا احساس لئے جیتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم تاریخ کے ایک ایسے لمحے میں جی رہے ہوں جہاں اب قابل ذکر واقعات اور طرب انگیز حادثات کا ظہور بند ہو گیا ہو، ایک ایسی تاریخ جہاں سب کچھ پہلے ہی وقوع پذیر ہو چکا ہو، جہاں آگے non-event کے علاوہ اور کچھ نہ ہو، ایک ایسی خالی خولی تاریخ میں جہاں تمام کارنامے پچھلوں نے انجام دے ڈالے ہوں، حال اور مستقبل کے انسانوں کے لئے اس کے علاوہ اور کیا رول بچتا ہے کہ وہ وہ پچھلوں کی تقدیس کا نغمہ گائے اور ان کی کامل اتباع و تقلید کو اپنا منتہاو مقصود قرار دے ڈالے۔

ماضی کی مدح سرائی صرف مسلمانوں کا قومی شعار نہیں، البتہ ہمارے یہاں اگر اس مسئلے نے ایک عارضہ کی شکل اختیار کر لی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری قوموں کے مقابلے میں ہم ماضی کو تجربہ گاہ کے طور پر دیکھنے کے بجائے ایام تقدیس کا حامل سمجھتے ہیں۔ بہت کچھ مصیبت الفاظ و اصطلاحات کی پیدا کردہ ہے جو بسا اوقات حقائق کے اظہار کے بجائے معانی کی ترسیل پر روک لگا دیتے ہیں یا کم از کم اتنا تو ضرور کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ذہنی شعور کو کسی قدر ان ہی مسلمات کا تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کا ناقدانہ تحلیل و تجزیہ ہمارے پیش نظر ہوتا ہے۔ اس بات کو میں ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ مغرب میں انسانی تاریخ کے مختلف ادوار کو سمجھنے کے لیے نشاۃ ثانیہ، تحریک اصلاح، روشن خیالی، صنعتی انقلاب، جدیدیت اور اب مابعد جدیدیت کی جو اصطلاحیں کھلے عام استعمال ہوتی ہیں ان کو جوں کا توں قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم پچھلوں کی عطا کردہ دانش کے معروضی مطالعے کے اہل نہیں رہ گئے ہیں۔ ایسا اس لیے کہ اصطلاحوں کا یہ بوجھ اپنے عہد کے مقبول عام ذہنی رویے اور سطح آب پر پائے جانے والی فکر کا اعلامیہ تو ضرور ہوتا ہے البتہ زیر آب پائے جانے والی فکر ان اصطلاحوں سے باہر رہ جاتی ہے۔ پھر یہ کہ اہل فکر کی

اس تاریخی درجہ بندی کو جوں کا توں قبول کرنا اس بات کا بھی اعلان ہے کہ ہماری فکر ان کے ذہنی ساخت اور تاریخی شعور کا تابع و محمل ہو کر رہ گئی ہے۔ فی زمانہ ہمارا فکری افق اتنا پیچیدہ گوناگوں اور متضاد تصورات کی آماجگاہ ہے کہ کوئی ایک غالب اصطلاح اس کے اظہار کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مغرب میں مابعد لاحقے کا فیشن دراصل اس بات کا غماز ہے کہ آگے جو کچھ ہے ان کی تشریح و تعبیر کا کام کسی ایک اصطلاح یا اصطلاحات کے مجموعے سے ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر Post-Modernism کے مسئلے کو لیجئے یہ ایک ایسی chaotic صورتحال کا بیان ہے جہاں انسانی اعمال کو کسی مسلمہ قدر کی بنیاد پر پرکھنا مشکل ہو گیا ہو۔ مثال کے طور پر مردانہ وجاہت جو کبھی جنگی معرکوں، شجاعت کی داستانوں اور انسانی حوصلے کی رہین منت سمجھے جاتے ہیں اور جہاں کہیں فٹ بال اور ہاکی کے کھلاڑیوں کو ان کی شاندار کارکردگی پر قابل مبارکباد سمجھا جاتا تھا اب wonder drugs یا enhancing pills کے استعمال نے ان کی رومانیت کے غبارے سے ہوا نکال دی ہے۔ مغرب کی ثقافتی زندگی میں (جس کے اثرات سے اب مشرق بھی نہیں بچا ہے) technology نے جو اودھم مچائی ہے اس نے انسان کی انفرادی زندگی کو تہہ و بالا کر دیا ہے۔ بیسویں صدی کی شاعری پر جن لوگوں کی نظر ہے اور جو مغرب کے موجودہ ثقافتی افق سے بھی واقف ہیں ان کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ Waste Land کا نوحہ اور Prufrock کے اظہار عشق کے مقابلے میں اب ہمیں ایک ایسی دنیا سے سابقہ ہے جو بنیادی طور پر مطلقہ عورتوں اور hookups کی دنیا ہے جہاں کسی کو نہیں معلوم کہ مرد وزن کے مابین تعلق کے لیے مروجہ دستور ہے کیا؟ اگر ایک طرف i-pod اور cellphone نے شخصی آزادی کے نئے افق پیش کیے ہیں تو دوسری طرف ان جدید آلات نے فرد کو introvert اور تنہا بنا دیا ہے۔ internet کی دنیا میں بظاہر کروڑوں لوگ ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ہر فرد ایک مہیب خوفناک جزیرہ بن گیا ہے۔ جب اہل مغرب اس ہیجان انگیز صورتحال کو Post-Modernism کا نام دیتے ہیں تو ان کے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ جدیدیت کی منطقی منزل ہے، ہمارے تہذیبی سفر کا تلچھٹ (by-product) ہے۔

مغرب میں زندگی کی بے سمتی اور معنویت کے فقدان کے نتیجے میں اگر ایک طرح کی مابعدیت کا احساس پیدا ہو چلا ہے اور بعض مفکرین برملا کہنے لگے ہیں کہ تاریخ کا سفر اب اپنے اختتام کو پہنچنے والا ہے تو اس کی وجہ ثقافتی زندگی کی اکتا دینے والی یکسانیت اور بڑے پیمانے پر بے رنگ امریکی ثقافت کی رنگارنگی اور اس کا ہیبت ناک غلبہ ہے۔ مغرب کے اب، نغموں اور مصوری میں اس اکتا دینے والی یکسانیت کا خاصا شور و غوغا پایا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا فطری آبشار خشک ہو چکا ہو۔ فرد جو اب محض ایک

صارف ہے اپنے اردگرد بے معنیٰ سرگرمیوں کا ظہور دیکھتا ہے۔ ایجادات و اختراعات کے نت نئے تماشوں کے باوجود وہ اپنے لئے تخلیق و تخیل کا امکان کم ہی پاتا ہے۔ ہفت روزہ تعطیل کے سلسلے میں غیر معمولی جوش و خروش کا پایا جانا اور پھر سوموار کی صبح کے خیال سے ذہنی تشنج کا شکار ہونا مغرب میں عوامی نغموں کا خاص موضوع رہا ہے۔ ہفتہ کے پانچ دنوں ڈراموں کے کردار کی طرح متحرک رہنا، وہ کچھ کئے جانا جس کے لئے فطری طور پر کام کرنے والوں میں داعیہ نہ ہو، اسی بات کا احساس دلاتے ہیں کہ ایک معنی، پرسکون زندگی جینا پچھلوں کا حصہ تھا۔ ہمارے حصے میں زندگی کی جو تلچھٹ آئی ہے اس میں فطری واقعات، اصلی کارناموں اور روحانی مسرت کا کوئی حصہ نہیں۔

مغرب کے مقابلے میں عالم اسلام کا نوحہ قدرے مختلف ہے جہاں مابعدیت کا احساس برق رفتار بے سمتی کے بجائے خوابیدہ سکون کا نتیجہ ہے۔ ابتدائے عہد میں جب مسلمانوں کے یہاں عقائد پر زوروشور سے گفتگو جاری تھی فقہاء و متکلمین، سبیل المؤمنین یا (مقبول عام اسلام) mainstream Islam کی تشریح و تعبیر میں مصروف تھے اور جب ان کے لئے ایک مقبول عام قالب کی تشکیل کا کام کچھ آسان نہ تھا، انھوں نے ضروری سمجھا کہ ابتدائی عہد کے آثاروایام کو مستند تعبیری منہج کے طور پر قبول کر لیں۔ اگر بات قرآن مجید اور اسوۂ رسولؐ تک محدود رہتی تو ان دو بنیادوں پر اگلوں کے لیے بھی اپنی اپنی تعبیر کی گنجائش باقی رہتی اور یہ ممکن ہوتا کہ آنے والی نسلیں بھی آسمانی پیغام کو اسی زندہ خلاقانہ رویے کے ساتھ قبول کرتیں جیسا کہ پچھلوں نے کیا تھا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو پچھلوں کی تفہیم اگلوں کے لئے معاون ہوتی مزاحم نہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ ابتدائی صدیوں میں کلامی فلسفیانہ اور ادیانِ سابقہ کے فقہی مناہج کے زیر اثر عقائد پر ہونے والی موشگافیوں نے جو بحرانی کیفیت پیدا کی اس نے اس وقت کے فقہاء و متکلمین کو اسلام کے ایک مستند اور عوامی قالب کی تشکیل پر مجبور کر دیا۔ مصیبت یہ ہوئی کہ اس پورے تعبیری عمل میں آثاروایام حتیٰ کہ اس عہد کی ثقہ اور غیر ثقہ تمام روایتوں کو کسی قدر تقدیس کا درجہ حاصل ہو گیا۔ **خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم** جیسی روایتوں کے ذریعے یہ خیال عام ہوا کہ ابتدائی تین نسلیں اسلام کے حتمی قالب کی تشکیل میں کلیدی اہمیت کی حامل ہیں۔ رہے اگلے تو ان کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ ان تین نسلوں کے فکر و عمل پر اپنے تعبیری منہج کی بنیاد رکھیں۔ تین نسلوں کی تقدیس کا یہ فسانہ بنیادی طور پر اہل یہود کے تعبیری منہج سے اثر پذیری کا نتیجہ تھا جہاں تنیم، اموریم اور سبوریم کو دین یہود کی تعبیر میں فیصلہ کن اہمیت حاصل تھی۔ کچھ یہی تصور ہمارے تعبیری منہج میں در آیا۔ ہم نے بھی ان کی طرح صحابۂ کرام کے بعد تابعین اور تبع تابعین کو تقدس مآب نسلوں کی حیثیت سے اپنی تاریخ میں جگہ دے دی۔ اس بات کی طرف

ہماری توجہ کم ہی گئی کہ کسی عہد یا نسل کی تقدیس کا تصور قرآنی نظامِ فکر سے متصادم تھا اور یہ کہ عہد رسولؐ ہو یا تابعین و تبع تابعین کا عہد، یہ ایام فکری اور عملی ہر دو اعتبار سے جانگسل جدوجہد سے عبارت تھے جہاں مخلص مسلمانوں کے جلو میں فتنہ پرور منافقین اپنی ہاری ہوئی بازی جیتنے کے لئے مختلف سطحوں پر سر توڑ جدوجہد کر رہے تھے۔ کبھی یہ ذہن مسلح بغاوت میں ظاہر ہوتا تو کبھی علمی سطح پر تراشیدہ روایتوں، منسوب الی الرسول اقوال، اسرائیلیات اور احبار و ربائی کے سابقہ تعبیری منہج کی شکل میں مخل ہوتا اور کبھی کلامی موشگافیوں کے زیر اثر ایسا محسوس ہوتا کہ خدا اور آخرت سے متعلق قرآنی بیانات تشنہ طلب رہ گئے ہیں۔ ایک ایسی فضا میں ابتدائی نسلوں پر تکیہ کرنے سے ایک عوامی اسلام کے خدوخال متعین کرنے میں تو یقیناً بڑی مدد ملی البتہ اس ذہنی رویے نے آنے والے دنوں میں خلاقانہ طرز فکر کے تمام راستے بند کر دیئے۔ رفتہ رفتہ پیغمبرانہ اسلام کے بجائے اسلام کے ایک تاریخی قالب کو الاسلام کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا۔

قرآنی نظام فکر کے مطابق دین اسلام کی مبادیات اور اس کے خدوخال کی تشکیل کا کام عین حیات نبویؐ میں انجام پا چکا تھا: (الیوم اکملت لکم دینکم) یہی وہ ایام تھے جب وحی ربانی اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ اسوۂ رسولؐ میں متشکل ہو گئی تھی۔ عہد رسولؐ میں اسلام کا جو بنیادی قالب وجود میں آیا تھا اس کی حیثیت قیامت تک متبعین محمدؐ کی تمام نسلوں کے لئے ایک لازمی اسوہ کی ہے۔ ہر عہد میں زمانی اور مکانی تبدیلیوں کے پیش نظر اس قالب کے مظاہر مختلف ہو سکتے ہیں البتہ یہ اپنی اصل میں اس ابتدائی قالب سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عہد صدیقی کا اسلامی قالب عہد رسولؐ سے قدرے مختلف متشکل ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ عہد فاروقی کا اسلامی قالب اپنے پیش رووں کے قائم کردہ نظائر سے برملا اختلاف کرے۔ البتہ اپنی اصل میں ان تمام قالبوں میں پیغمبرانہ اسلام کی وہی روح کارفرما نظر آئے گی۔ جس طرح زمان و مکان کی تبدیلی کی وجہ سے عہد فاروقی میں نظائر محمدیؐ اور نظائر صدیقیؓ کو خیرباد کہتے ہوئے الگ نظائر کے قیام کی ضرورت پیش آئی اسی طرح آنے والی نسلوں کو بھی یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ بنیادی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے عہد کے لیے اپنے نظائر خود دریافت کریں۔ اس کے برعکس اگر ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ پچھلوں نے جو کچھ کیا وہ فہم دین کا آخری پتھر ہے یا اسے کسی درجے میں تقدس حاصل ہے تو ہم دین اسلام کی پیروی کے بجائے اپنے ہی جیسے انسانوں کی پرستش پر خود کو مجبور پائیں گے۔

یہ خیال کہ دین مبین کی تشریح و تعبیر کا کام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انجام پا چکا ہے۔ بعض ان مفروضات پر قائم ہے جن کی اسلامی فکر میں سرے سے کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی۔ ذرا غور کیجئے تاریخ کی یہ تفہیم جو خلفائے اربعہ کو خلفائے راشدون قرار دیتی ہے اور جس پر سنّی اسلام کی عمارت قائم ہے آخر اس بات کا اسلامی عقیدے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح فقہائے اربعہ کے معاملے کو لیجئے جو خالصتاً تاریخی عمل کی پیداوار ہیں ان کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کے کسی کے ایمان پر کیسے حرف آ سکتا ہے؟ یا آثار و ایام کی وہ کتابیں جنھیں ہماری سماجی تاریخ کے بعض لمحات میں بوجوہ خصوصی اعتبار حاصل ہو گیا بھلا ان کو قبول کرنے یا نہ کرنے سے خدا اور اس کے رسولؐ سے ہماری وابستگی کیسے متاثر ہو سکتی ہے؟ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم ان قضیوں کو عقائد و معتقدات کے دفتر سے خارج کر دیں تو سنّی اسلام کی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ کچھ یہی حال شیعہ اسلام کا بھی ہے جہاں ائمہ معصومین کا سلسلہ، روایتوں کی ترتیب و تدوین کا کام، خلیفہ بلا فصل کا عقیدہ عہد رسولؐ کے بہت بعد وجود میں آیا۔ اگر ہم تاریخی عمل کی بساط لپیٹ سکیں اور ہمارے لئے اسلام کے بنیادی قالب تک رسائی ممکن ہو سکے تو شیعہ، سنّی اور ان جیسے اسلام کے مختلف قالب سے نجات کی راہ نکل سکتی ہے۔ اتنا ہی نہیں امت مسلمہ ان بے سمت کارِلایعنی سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہے جس نے عرصہ ہائے دراز سے اسے مسرت آمیز تخلیقی عمل سے محروم کر رکھا ہے۔ اس نکتے کو میں چند مثالوں سے واضح کروں گا۔

عرصہ ہائے دراز سے ہم ایک ایسے اسلام کے نقیب رہے ہیں جہاں ہم جیسے تاریخی انسانوں نے تعبیر کا حتمی کام انجام دے ڈالا ہے۔ تاریخ کے مستند قالب کی تشکیل ان کے ذریعے جلوہ گر ہو چکی ہے لہٰذا ہمارے لیے اب کرنے کو کچھ بچا ہی نہیں۔ اگر ائمہ اربعہ غور و فکر کا تمام کام انجام دے چکے اور اگر صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین کی تین نسلوں کو تقدیسی ایام (Canon Period) کا مرتبہ حاصل ہے تو ہمارے لئے ان کی راہوں سے الگ اپنے عہد کے لیے اپنے نظائر کی تعمیر کا کام ممکن نہیں ہو سکتا۔ خدا کا یہ مطالبہ: (أفلا يتدبرون القرآن أم على قلوب أقفالها) اور دوسری طرف متوارث اسلام کا یہ اصرار کہ اسلاف کے فہم سے الگ کسی فہم کو اعتبار نہیں مل سکتا ہمیں ایک ایسی دنیا میں محبوس کر دیتا ہے جہاں واقعات و حوادث نے جنم لینا بند کر دیا ہو، جہاں تاریخ کے تمام واقعات صدیوں پہلے انجام پا چکے ہوں اور ہمارے ہاتھ خالی خولی بے معنیٰ ایام کے علاوہ کچھ بھی نہ آیا ہو۔

ہمیں اس حقیقت کے اظہار میں تکلف سے کام نہیں لینا چاہیے کہ اسلام کے انبیائی قالب کی بنیاد پر ایک عالمی معاشرہ کا قیام ابھی باقی ہے۔ محمد رسول اللہؐ نے وحدتِ انسانیت، اکرامِ آدمیت اور توحید خالص پر مبنی جس انقلاب کا بٹن دبایا تھا اس کی منتہا و معراج کا کھلے

عام مشاہدہ ابھی باقی ہے۔ منصبِ رحمۃ للعالمینی کی یہی وہ معنویت ہے جس کی تکمیل کا کام آنے والی تاریخ میں متبعین محمدؐ کو انجام دینا ہے۔ گویا کہہ لیجئے کہ عہد صدیقی سے لے کر اب تک زمانی اور مکانی طور پر اسلام کے جن مختلف قالب کا ظہور ہوتا رہا ہے ان کی حیثیت ایک ارتقائی اور تدریجی عمل کی ہے جس کے حتمی اور منطقی منزل کے بعد تاریخ اپنی معنویت کھو دے گی۔ کائنات کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔

ان بیانات سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مستقبل کا اسلامی قالب عہد صدیقی یا عہد فاروقی کے اسلامی قالب سے اوفق ہو گا۔ ان تمام قالبوں میں اصولی طور پر تو کوئی اختلاف نہ ہو گا البتہ آنے والے دنوں میں تمدن اور technology کی بہتر سہولتوں کے سبب اس نبوی قالب کو logistically کہیں بہتر طور پر برتا جاسکے گا۔ نبوی انقلاب کو اس کے حتمی اور منطقی انجام تک پہنچانے کا کام ابھی باقی ہے۔ جس طرح پچھلی نسلوں نے اس کام میں اپنا حصہ ڈالا تھا اسی طرح ہر آنے والی نسل کو اس مہم میں اپنی قوت و توفیق کے مطابق لازماً شریک ہونا تھا لیکن ہوا یہ کہ اسلام کا ایک canonized version وجود میں آجانے سے وحی ربانی پر تخلیقی غور و فکر کا سلسلہ یکسر موقوف ہو گیا۔ وحی کے بجائے وحی کی انسانی تعبیرات ہمارا مقدر بن گئیں۔ non-event کے ان ایام میں ہمارا کام صرف یہ طے پایا کہ ہم مہدئ منتظر یا امام غائب کی راہ تکا کریں جس کی آمد سے ایک بار پھر ہماری زندگیوں میں عظیم واقعات کی ظہور پذیری کا سلسلہ چل نکلے گا۔ کہا جا سکتا ہے کہ مسیح کی آمد ثانی یا مسیحا کی آمد کے توہمات سے عیسائی اور یہودی قومیں بھی خالی نہیں۔ اہلِ کتاب جب تک ان توہمات کے زیر اثر انتظار کی گھڑیاں گنتے رہے دنیا کے مرکزی اسٹیج پر انھیں کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا، البتہ جب اکتشافی علوم کے زیر اثر ان کا روایتی مذہبی ذہن متزلزل ہونے لگا اور ان کی معتد بہتعداد نے فکر و عمل کی نئی راہیں اختیار کیں تو انھیں دنیا میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی۔ کاش کہ اہل یقین نے تخلیقی ذہن کا مظاہرہ کیا ہوتا تو آج انسانیت کو موجودہ بے سمتی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہودی اور عیسائی قومیں مذہب کے نام پر رسومِ دینداری کو اپنا حرز جاں بنائے ہوئے تھیں۔ ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ نئے بدلتے ماحول میں نیا راستہ اختیار کرتے کہ ان کے یہاں قدماء اور اساطین مذاہب پر تنقید فی نفسہ مذہب سے بغاوت پر محمول کی جاتی تھی۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ مسلمان جنھیں احبار و رہبان کی اتباع سے باز رہنے کی تاکید کی گئی تھی اور جنھیں آباء پرستی یا اسلاف پرستی سے لازماً اجتناب کرنا تھا ان کے یہاں بھی غیر خلاقانہ جامد تقلیدی رویے کو گہری مذہبیت کا علامیہ سمجھا جانے لگا۔

وحی ربانی کے بجائے ابتدائی تین نسلوں کی فہم کو حتمی معیار قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری مذہبی اور اجتماعی زندگی creative originality سے محروم ہو گئی۔ قرآن مجید کے مقابلے میں انسانی تعبیرات اور ثانوی مآخذ میں بھلا یہ قوت کہاں ہو سکتی تھی کہ زمان و مکان کی تبدیلی کا ساتھ دے سکے۔ زمانہ برق رفتاری سے آگے بڑھتا رہا لیکن امت مسلمہ کی مذہبی فکر اور ذہنی ساخت عہد وسطیٰ کی تعبیرات سے آگے نہ بڑھ سکی۔ بدلی ہوئی اجنبی دنیا میں متوارث اسلام کے فکری سرمائے نے بسا اوقات مضحکہ خیز صورتحال کو جنم دیا۔ سچ پوچھئے تو ہماری پوری اجتماعی زندگی پر ایک طرح کے Pastiche کا گمان ہونے لگا۔ دینی زندگی کے مظاہر تو موجود تھے۔ مسلمانوں میں اتباعِ سنت کا ذوق و شوق بھی پایا جاتا تھا لیکن صاف محسوس ہوتا تھا کہ یہ ساری چلت پھرت روح سے خالی ہو چکی ہے۔ ثانوی مآخذ اسلام کی نقل یا کاپی پیدا کر سکتے تھے کہ تازہ بہ تازہ اصل اسلام تک رسائی کے لئے لازم تھا کہ ہم اپنے حالات کے مطابق وحی ربانی سے راست اکتساب کرتے۔ گزشتہ ایک ہزار سال کے فکری سرمائے پر نظر ڈالئے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان ضخیم مجلدات میں ایک ہی خیال کی مختلف اسالیب میں آبیاری کی گئی ہے۔ فقہاء کے لامتناہی دواوین، فتاوٰوں کی ضخیم مجلدت، کتب روایات کی تخریج و تنقید اور ان پر حواشی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، ایک تفسیر کے بعد اسی خیال کی تائید و توثیق میں مزید تفسیروں کی تالیف، مشہور کتابوں کی تلخیص اور پھر تلخیصات کی عقدہ کشائی کے لئے مختلف شرحوں کا وجود میں آجانا یہ سب کچھ اسی لیے ممکن ہو سکا کہ ہم ابتدائی عہد کے تقدیسی حصار کو توڑنے اور وحی ربانی سے راست رہنمائی کی اپنے اندر ہمت نہ پاتے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان آج بھی اس گئی گزری حالت میں اسلام کو اپنے لئے نجات کی واحد راہ سمجھتے ہیں۔ ہماری مذہبی زندگی کی چہل پہل، عبادات کا ذوق و شوق، نماز، روزہ، حج، زکوۃ کی گرم بازاری سے بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ آج ہم بھی خدا کے احکام بجا لانے میں دوسری تمام قوموں پر سبقت رکھتے ہیں۔ لیکن حج کا عظیم اجتماع جو سفر کی سہولتوں کے سبب ہر سال مسلسل بڑھتا جاتا ہے، نماز اور روزے کے مظاہر جنھیں بعض تبلیغی اور اصلاحی کوششوں کے سبب اس زمانے میں خاصا فروغ حاصل ہوا ہے یا جہاد کے وہ مظاہر جس پر کمال جانبازی کے ساتھ مسلم نوجوان مختلف ملکوں میں عامل ہیں۔ یہ سب کچھ نتائج کے اعتبار سے انتہائی مایوس کن ہیں۔ ہماری مذہبی اور اجتماعی زندگی اتنی بہت ساری جدوجہد اور قربانیوں کے باوجود عہد رسولؐ جیسے نتائج پیدا کرنے میں ناکام ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رسومِ دنیداری کے یہ مظاہر اپنی اصل تخلیقی روح سے خالی ہیں۔ بظاہر تو مذہبی زندگی کا کاروبار زور و شور سے جاری ہے مگر فی الحقیقت ان کی حیثیت ڈرامے کے اسکرپٹ اور ان کے کرداروں سے زیادہ نہیں۔ اس بات کی وضاحت کے لیے میں خطبۂ جمعہ کی ایک مثال پیش کروں گا جو ابتدائی ایام میں ایک مؤثر سماجی فورم کی حیثیت سے ہماری رہنمائی کا کام انجام دیتا تھا اور

آج اس کی روح سلب ہو جانے کی وجہ سے غیر عرب ممالک میں خطبۂ جمعہ ایک پیروڈی بن کر رہ گیا ہے جہاں سامعین کو مقفّیٰ مسجع عبارتوں میں ایسے بیانات سے ہر ہفتہ سابقہ پیش آتا ہے جو اس کی زندگی پر کوئی مثبت اثر تو کیا ڈالتے تضیع اوقات کا باعث ہوتے ہیں۔ اس مثال پر مسلمانوں کی پوری مذہبی زندگی کو قیاس کیجئے جہاں بالکل اسی طرح زمان و مکاں اور سیاسی حقائق بدل جانے کے باوجود عہد سلاطین کے خطبے ہمیں امام عادل کی اتباع کی ترغیب دے رہے ہیں۔ اگر ہمارے لئے یہ ممکن ہوتا کہ ہم خطبے کی غایت کے پیش نظر، اسے عہد جدید میں مؤثر بنانے کے لیے، اسے وحی ربانی کی روشنی میں از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کرتے تو یقیناً اس کے نتائج مختلف ہوتے۔

ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم قدماء کے ذہن سے نئی دنیا کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ بھلا جو لوگ صدیوں پہلے ایک بالکل ہی مختلف ماحول میں زندگی جیتے رہے، جنھیں اکیسویں صدی کی زندگی کا کچھ تجربہ نہ تھا انھیں نئی دنیا کی قیادت پر مامور کرنا ان کے اوپر بھی ظلم ہے اور ہمارے لئے بھی اس کے نتائج تباہ کن ہی ہو سکتے ہیں جب خدا کی تازہ بہ تازہ کتاب اپنے تمام تر ابعاد کے ساتھ ہمارے درمیان موجود ہو تو ہمیں یہ کب زیب دیتا ہے کہ ہم اسے غور و فکر کا محور بنانے کے بجائے اپنے ہی جیسے انسانوں سے مشکل کشائی کے طالب ہوں۔

اصولی طور پر ہمارے اہلِ خرد کے لیے یہ تسلیم کرنا شاید مشکل نہ ہو کہ قرآن مجید سے راست اکتساب ایک بار پھر ہماری خالی خولی non-event زندگیوں کو طرب انگیز سرگرمیوں کی آماجگاہ بنا سکتا ہے۔ بہتوں کے لیے علمائے سلف کے تعبیری منہج کا تحلیل و تجزیہ ہو سکتا ہے شاید اجنبی خیال نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ حالات کی سنگینی کے پیش نظر بعض حلقوں میں رسومِ دین داری کے بجائے غایت دین کی جوت جگانے کا داعیہ پہلے سے پایا جاتا ہو۔ جو امت گزشتہ کئی صدیوں سے ایک فکری راستے کی متلاشی ہو وہاں ان خیالات کو خوش آمدید کہنے والے بآسانی مل جائیں گے۔ البتہ عام لوگوں کے لئے یہ قبول کرنا کچھ آسان نہ ہو گا کہ قرآن مجید کو موجودہ سیاق و سباق میں پڑھنا ہمیں نئے نتائج اور نئے فیصلوں تک بھی پہنچا سکتا ہے۔ اب تک جو لوگ تفسیر ماثورہ کے خوگر رہے ہیں یا جو متقدمین کے ذہن سے قرآن مجید کو پڑھنے کے عادی ہیں اور جن کے لیے قرآن مجید کے الفاظ میں معانی کی روح تعبیری حواشی کے ذریعے پھونکی جاتی رہی ہے ان کے لیے اس مروجہ منہج کو خیر باد کہنے کا واضح مطلب یہ ہو گا کہ قرآن مجید کے الفاظ راست ہم سے کلام کرنے لگے ہوں۔ منجمد الفاظ میں حیات افزا زندگی کا پیدا ہو جانا یقیناً ایک انبساط انگیز تجربہ ہو گا۔ یہ کچھ وہی صورت حال ہو

گی جو کسی نئے نبی کی آمد آمد پر ہوتی ہے۔ اس عمل میں جہاں ایک طرف نئی حیات افزا زندگی کا مژدہ ہے وہیں ایک بڑا چیلنج بھی پوشیدہ ہے۔

قرآن مجید کو اکیسویں صدی کی کتاب ہدایت کے طور پر پڑھنے کا واضح مطلب یہ ہو گا کہ ہم اپنے آپ کو عہد صدیقی اور عہدِ فاروقی کی طرح ایک ایسے اسلام کے جلو میں پائیں جس پر نہ تو پچھلوں کی التباسات فکری کا سایہ ہو اور نہ ہی کسی نئی صورتحال میں ہم آگے کا راستہ بند پاتے ہوں۔ فی زمانہ کتاب ہدایت سے ہمارے اکتساب کی کوشش قدماء کے بعض ان مسلمات کے سبب ممکن نہیں ہوتی جو قرآنی پیغام سے متصادم ہونے کے باوجود ہماری مقبول عام اسلامی فکر کا حصہ بن گئی ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) کے قرآنی بیان کو پڑھتے ہیں تو ہمارا ذہن اس بیان کے قابل عمل ہونے کے بارے میں مخمصے کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر تقویٰ واقعی انسانوں کے فضل و شرف کا معیار ہے تو پھر الائمہ من القریش جیسے فرمودات کے لئے کہاں گنجائش رہ جاتی ہے۔ (کل نفس بما کسبت رھینہ) (لیس الانسان الا ما سعی) اور ان جیسی دیگر آیات عزوشرف کی بنیاد کسبی عوامل پر رکھتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس مروجہ اسلام اس خیال کی پر زور تبلیغ کرتا ہے کہ کسی شخص کا کسی خاندان یا نسل میں پیدا ہو جانا ہی اسے شرف فضیلت سے سرفراز کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اہل بیت اور خصوصاً خانوادۂ علی کے سلسلے میں سنیوں میں نسبتاً کم اور شیعوں میں قدرے زیادہ فضیلت کے چرچے عام ہیں۔ قرآن مجید تو (ما کان محمد أبا أحد من رجالکم و لکن رسول اللہ) کے بیان سے اس نکتے کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ محمد رسول اللہ کے خاندانی سلسلہ لا انقطاع ایک بڑی مصلحت کے پیش نظر ہے لیکن مروجہ اسلام اس بات پر مصر ہے کہ امت آلِ رسولؐ کی خاندانی برتری کو تسلیم کرے اور ان کی تمام آنے والی نسلوں پر خواہ ان کے ذاتی اعمال جیسے بھی ہوں درود و سلام بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھے۔ قرآن کے منجمد الفاظ کو جسے مروجہ اسلام نے صدیوں سے خاموش کر رکھا ہے، اگر پھر سے بولنے کا موقع دیا گیا تو اس قسم کی نسل پرستی کے لیے گنجائش باقی نہ رہے گی۔ کہا جاتا ہے کہ عہد فاطمی میں استحکام خلافت کے کوئی سو سال بعد عید فاطمہ اور اس قبیل کی دیگر تقریبات کو سیاسی عوامل کے تحت فروغ دیا گیا اسی عہد میں آلِ رسولؐ کا موجودہ تصور بھی تشکیل پایا۔ عجب نہیں کہ اس قبیل کی دوسری دعائیں اور تسبیح فاطمہ اسی زمانے میں وجود میں آئی ہو۔

یہ تو تھی قدماء کی التباساتِ فکری سے باہر آنے کی ایک امکانی مثال۔ اب آیئے اس نکتہ کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ ساتویں صدی میں نازل ہونے والی کتاب جب اکیسویں صدی میں خلاقانہ دل و دماغ اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ پڑھی جائے گی تو یہ عمل اپنے

اندر کن اندیشوں اور امکانات کا حامل ہو گا۔ مثال کے طور پر آیت وراثت کو لیجئے جہاں بیٹی کے مقابلے میں بیٹے کو یک گونہ فوقیت حاصل ہے۔ ساتویں صدی کے پدارانہ عرب معاشرے میں جہاں عورت پر معاشی ذمہ داریوں کا کوئی بوجھ نہ تھا، نان ونفقہ کی ذمہ داری سے وہ یکسر آزاد تھی، باپ، شوہر، بھائی اور قرابت کے مختلف رشتوں کے ذریعے اسے جو کچھ بھی ملتا اس کی حیثیت ایک جمع پونجی کی ہوتی۔ جبکہ مرد وارثین سماجی اور عائلی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبے ہوتے۔ ایک ایسے معاشرے میں وراثت کی یہ ترتیب عورت کے حق میں تھی۔ البتہ آج شہری زندگی میں بالخصوص مغرب کے بڑے شہروں میں جہاں عورت اور مرد کو اپنی انفرادی حیثیت میں زندگی کا مکمل بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہے وہاں باپ کے ترکے میں بیٹی کو مساوی حصے سے محروم کرنا ہو سکتا ہے کہ سماجی انصاف کے تقاضوں کے مطابق نہ ہو۔ جو لوگ حضرت عمر کے فہم انصاف سے واقف ہیں ان کے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ ہو گا کہ آپ نے حالات کے بدل جانے کی وجہ سے سابقہ نظائر کو کس طرح بدل دیا حتیٰ کہ قطع ید کی قرآنی نص وقتی طور پر اس وجہ سے منجمد کر دی گئی کہ قحط کے زمانے میں اس حد کا اطلاق قرینِ انصاف نہ تھا۔ اس کے برعکس جو لوگ اس بات پر اصرار کریں کہ فہم قرآن کے ہمارے نتائج متقدمین کی تعبیرات سے عین مطابق ہوں تو انھیں چاہیے کہ وہ اکیسویں صدی کی دنیا میں ساتویں صدی کا ماحول فراہم کریں کہ text کی معنویت اور اس کے اطلاقات context کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر context بدل جائے تو text کے اطلاقات بھی لازماً بدل جائیں گے۔ قرآن کو موجودہ سیاق وسباق میں پڑھنا امکانات کے ساتھ ساتھ اندیشوں کا بھی حامل ہے۔ وحی جیسی عظیم شئے سے انسانی دل و دماغ کا رابطہ ایک بڑا چیلنج ہے۔ اس عمل میں غلطیوں کے امکانات سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن خدا جو ہم سے کہیں زیادہ ہماری کمزوریوں سے واقف ہے وہ اگر ہم سے اس بات کا طالب ہے کہ ہم قرآن مجید کے صفحات میں غور وفکر کا سلسلہ جاری رکھیں تو ہمارے لئے اس چیلنج سے فرار کی کوئی راہ نہیں رہ جاتی۔

(راشد شاز کی کتاب " اسلام: مسلم ذہن کی تشکیل جدید" سے منتخب تحریر)